© rasailojaraid.com

ابوسلمان شاہجہانپوری

(آخری قسط)

مولانا ابوالکلام آزادؒ اور اُن کی کتبِ تفسیر

ترجمہ و تفسیر کے سلسلے کی آخری کڑی "مقدمہ، تفسیر" تھا۔ مقدمہ قرآن مجید کے مقاصد و مطالب پر اصولی مباحث کا مجموعہ تھا۔ مولانا چاہتے تھے کہ اس میں مطالب قرآنی کے جوامع و کلیات مدون ہو جائیں۔ تذکرہ میں مولانا نے کئی جگہ اس کا ذکر کیا ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس کا نام البصائر¹ تھا۔ ایک جگہ فلسفہ و عقل اور کتاب و سنت کی رہنمائی پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"یہ مقام منجملہ روح الروح معارف کتاب و سنت و حقیقۃ الحقائق قرآن و شریعت کے ہے۔ اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ تفسیر البیان میں ایک سے زائد مواقع پر اس کی تشریح و توضیح ملے گی اور اس سے

---

¹ البصائر کے نام سے مولانا ایک غیر سیاسی، علمی و دینی پرچہ بھی نکالنا چاہتے تھے۔ الہلال میں اس کا اشتہار بھی شائع ہوتا رہا تھا۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کے نام خط مورخہ ۲۶ رمئی ۱۹۱۳ء میں تحریر فرماتے ہیں :-

(بقیہ حاشیہ دوسرے صفحے پر)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

زیادہ مقدمہ تفسیر موسوم بہ البصائر میں بعنوان "حقیقتِ ایمان و کفر"[۱]

مولاناؒ کے نزدیک مقدمے کی بڑی اہمیت تھی اور اس کی ضرورت نہ صرف برصغیر کے مسلمانوں بلکہ پوری دنیائے اسلام کو تھی - اس لیے انھوں نے مقدمہ عربی میں مرتب کیا تھا۔ مولانا غلام رسول مہر فرماتے ہیں :-

---

(حاشیہ صفحہ گزشتہ)

"کیا آپ اس کو پسند فرمائیں گے کہ البصائر کے لیے جو ایک ماہوار غیر سیاسی، خالص علمی و دینی پرچہ ہوگا، جو جولائی سے شائع ہو جائے گا، کوئی مضمون ارقام فرمائیں یا کسی اہم علمی موضوع پر ہو اور ترجمہ ہو یا بطور خود ..... البصائر کے لیے مضمون ۱۵ ارجون تک ضرور مل جانا چاہیے۔ پہلا نمبر مدت سے مرتب ہے، صرف بعض ابواب باقی ہیں"

(تبرکاتِ آزاد - صفحہ ۹۱)

مولانا غلام رسول مہر صاحب اس پر حاشیے میں فرماتے ہیں :-

"ایک ماہوار دینی رسالہ جس کا اعلان پہلے البیان کے نام سے ہوا تھا، اسے صرف تفسیر اور علوم و معارف قرآن کے لیے مخصوص رکھنا چاہتے تھے۔ پھر یہ قرار پایا کہ یہ رسالہ دینی و علمی ہونا چاہیے اور اس کا نام البصائر تجویز ہوا۔ زیرِ غور مکتوب میں اسی کا ذکر ہے۔ پھر الہلال میں اشتہار بھی دیا گیا تھا کہ البصائر شوال ۱۳۳۱ھ (ستمبر ۱۹۱۳ء) سے شائع ہونے لگے گا۔ بلکہ اس کا ایک عربی ایڈیشن بھی شائع کرنے کا ارادہ تھا لیکن البصائر نہ اردو شائع ہوا نہ عربی۔ (تبرکاتِ آزاد مرتبہ غلام رسول مہر۔ ناشر کتاب منزل - لاہور۔ صفحات ۹۱ - ۹۲)

غرض کہ واضح رہنا چاہیے کہ "البصائر المعروف بہ مقدمہ تفسیر" البصائر ماہوار رسالے سے بالکل الگ اور مختلف چیز تھی۔

[۱] تذکرہ - ناشر کتابی دنیا لاہور صفحہ ۹۲:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

"ایک مرتبہ (مولانا نے) خود ہی کہا کہ مقدمہ عربی لکھا ہے۔ میں نے اس کا سبب پوچھا تو فرمایا کہ اس کی ضرورت پوری دنیائے اسلام کو ہے۔ عربی کے ذریعے یہ مطالب جلد از جلد دنیائے اسلام کے ہر حصے میں پہنچ جائیں گے۔ بعد ازاں انھیں اردو میں منتقل کر لینا مشکل نہ ہوگا۔" ۵۱

مقدمہ، وقت کی ایک اہم چیز تھا۔ مولانا نے تذکرہ اور ترجمان القرآن میں متعدد مقامات پر تفصیلی بحث کے لیے مقدمے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ان مباحث کی نوعیت اور مجمل اشارات سے مقدمے کے مباحث اور ان کی اہمیت کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ مولانا مہر صاحب فرماتے ہیں:-

"مولانا جب کبھی قرآن کے باب میں گفتگو فرماتے تھے اور مقدمے کا ذکر آ جاتا تھا تو صاف معلوم ہوتا تھا کہ ان کے نزدیک یہ بڑی اہم کتاب تھی۔ ایک مرتبہ فرمایا کہ دیکھیے قرآن کے متعلق میں نے تمام اصولی مطالب کو مقدمے کے چوبیس عنوانوں کے تحت تقسیم کر لیا ہے۔ پھر ان پر ایسے انداز میں بحث کی ہے کہ کوئی چیز رہ نہ جائے جسے قرآن کو سمجھنے کے سلسلے میں جاننا ضروری ہے۔" ۵۲

تذکرہ اور ترجمان القرآن میں متعدد مقامات پر بحث کو سمیٹتے ہوئے اس قسم کے جملے نوک قلم پر آ گئے ہیں:-

(۱) شرح حقیقت تحریف شریعت علی الخصوص فتنتین عظیمتین یونانیہ و عجمیہ کے لیے مقدمہ تفسیر باب بست و یکم اور تفسیر سورۂ فاتحۃ الکتاب کو دیکھنا چاہیے۔" ۵۳

---

۵۱ دیباچہ باقیات ترجمان القرآن، مرتبہ مولانا غلام رسول مہر۔ ناشر شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور صفحہ ۱۶

۵۲ ایضاً صفحہ ۱۷

۵۳ تذکرہ صفحہ ۱۱۰

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(۲) یہاں جو کچھ لکھ دیا متفرق اشارات تھے - اس مطلب کو متعدد مقامات میں مفصل لکھا جا چکا ہے - سب سے زیادہ "مقدمہ تفسیر" میں۔[۵۱]

(۳) سورۂ یونس کے ایک نوٹ میں عدم احاطہ علم اور تکذیب حقائق کی بحث میں لکھتے ہیں :-

"یہ مقام مہمات معارف میں سے ہے اور تفسیر اس کی مقدمے میں ملے گی۔"[۵۲]

(۴) اسی طرح سورۂ ہود کے آخری مقالے میں جہاں قصص قرآنی کے مبادی و مقاصد کی بحث ہے - اس ایک جگہ بحث کو مختصر کر دینے کے بعد حاشیے میں فرماتے ہیں :-

"مطالب قرآنی کا یہ مقام نہایت وسیع ہے اور اس قدر تفصیل کے بعد بھی بے شمار اطراف بحث تشنہ رہ گئے ہیں - لیکن اس کے سوا چارہ نہیں کہ تکمیل بحث کے لیے مقدمے کا انتظار کیا جائے۔"[۵۳]

(۵) اس قسم کے تمام مقامات اور ان کے مباحث[۵۴] کے مطالعے سے مقدمے کے مطالب، اس کی وسعت اور اس کے علمی و تحقیقی معیار کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

میں یہاں ان مقامات کی تفصیل اور تعارف کے بجائے، ان اصولوں کی جانب توجہ دلانا چاہتا ہوں جن کے تحت مولانا نے ان تمام اسباب و مؤثرات کو سمیٹ لیا ہے، جو فہم حقیقت میں مانع ہوئے - مولانا فرماتے ہیں :-

"میں نے مقدمہ تفسیر میں کوشش کی ہے انھیں چند اصول و انواع کے ماتحت سمیٹ لوں - اس سلسلے میں حسب ذیل دفعات قابل غور ہیں :-

---

۵۱ تذکرہ صفحہ ۲۴۵

۵۲ ترجمان القرآن جلد دوم، صفحہ ۱۸۱

۵۳ ایضاً صفحہ ۱۱۵

۵۴ مثلاً ترجمان القرآن جلد دوم - صفحات ۲۱۵ - ۴۴۴ - ۳۴۵ - ۴۸۷ - ۴۹۵ وغیرہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(۱) قرآن حکیم اپنی وضع، اپنے اسلوب، اپنے انداز بیان، اپنے طریق خطاب، اپنے طریق استدلال، غرض کہ اپنی ہر بات میں اپنا بے میل فطری طریقہ رکھتا ہے۔ اور یہی وہ بنیادی امتیاز ہے جو انبیائے کرام علیہم السلام کے طریق ہدایت کو علم و حکمت کے وضعی طریقوں سے ممتاز کر دیتا ہے۔

قرآن جب نازل ہوا تو اس کے مخاطبوں کا پہلا گروہ بھی ایسا ہی تھا۔ تمدن کے وضعی اور صناعی سانچوں میں ابھی اس کا دماغ نہیں ڈھلا تھا، فطرت کی سیدھی سادی فکری حالت پر قانع تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ قرآن اپنی شکل و معنی میں جیسا کہ واقع ہوا تھا ٹھیک ویسا ہی اس کے دلوں میں اتر گیا اور اسے قرآن کے فہم و معرفت میں کسی طرح کی دشواری محسوس نہیں ہوئی۔ صحابۂ کرامؓ پہلی مرتبہ قرآن کی کوئی آیت یا سورت سنتے تھے اور سنتے ہی اس کی حقیقت پا لیتے تھے۔

لیکن ..... جوں جوں وضعیت کا ذوق بڑھتا گیا۔ قرآن کے فطری اسلوبوں سے طبیعتیں نا آشنا ہوتی گئیں۔ رفتہ رفتہ وہ وقت آگیا کہ قرآن کی ہر بات وضعی اور صناعی طریقوں کے سانچوں میں ڈھالی جانے لگی۔ ...... فطرت سے جب بُعد ہو جاتا ہے اور وضعیت کا استغراق طاری ہو جاتا ہے تو طبیعتیں اس پر راضی نہیں ہوتیں کہ کسی بات کو اس کی قدرتی سادگی میں دیکھیں۔ وہ سادگی کے ساتھ حسن و عظمت کے تصور کر ہی نہیں سکتیں۔ وہ جب کسی بات کو بلند اور شان دار دکھانا چاہتی ہیں تو کوشش کرتی ہیں کہ زیادہ سے زیادہ وضعیت اور صناعیت کے پیچ و خم پیدا کر دیں۔ یہی معاملہ قرآن کے ساتھ پیش آیا .... خلف کی طبیعتوں پر یہ بات شاق گزرنے لگی کہ قرآن اپنی سیدھی سادی شکل میں نمایاں ہو۔ ان کی وضعیت پسندی اس پر قانع نہیں ہو سکتی تھی۔ انھوں نے قرآن کی ہر بات کے لیے وضعیت کے جامے تیار کرنے شروع کر دیئے اور یہ جامہ چوں کہ اس پر درست نہیں آسکتا تھا، اس لیے یہ تکلف پہنانا چاہا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ حقیقت کی موزونیت باقی نہ رہی، ہر بات ناموزوں اور الجھی ہوئی بن کر رہ گئی ......

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بہرحال یاد رہے کہ وضعیت کے سانچے جتنے ٹوٹتے جائیں گے، قرآن کی حقیقت اُبھرتی آئے گی۔

قرآن کے اسلوب بیان کی نسبت لوگوں کو جس قدر مشکلیں پیش آئیں محض اس لیے کہ وضعیت کا استغراق ہوا اور فطریت کی معرفت باقی نہ رہی۔

قرآن کے مختلف حصوں اور آیتوں کے مناسبات و روابط کے سارے اُلجھاؤ صرف اسی لیے ہیں کہ فطریت سے بُعد ہو گیا اور وضعیت ہمارے اندر بسی ہوئی ہے ہم چاہتے ہیں، قرآن کو بھی ایک ایسی مرتب کتاب کی شکل میں دیکھیں جیسی کتابیں ہم مرتب کرتے ہیں۔

قرآن کی زبان کی نسبت بحثوں کا جس قدر انبار لگا دیا گیا ہے وہ بھی محض اس لیے ہے کہ فطریت کے سمجھنے کی ہم میں استعداد باقی نہیں رہی۔

قرآن کی بلاغت کا مسئلہ ہمارے وجدان کے لیے اس قدر سہل، مگر ہمارے دماغ کے لیے اس قدر دشوار کیوں ہو رہا ہے؟ صرف اس لیے کہ وضعیت کا خود ساختہ ترازو ہمارے ہاتھ میں ہے۔ ہم چاہتے ہیں اسی سے قرآن کی بلاغت بھی وزن کریں۔

قرآن کا طریق استدلال کیوں نمایاں نہیں ہوتا؟ اس کے تمام دلائل و براہین جنھیں وہ "حُجّۃ بالغہ" سے تعبیر کرتا ہے، کیوں مستور ہو گئے ہیں؟ اسی لیے وضعیت کے استغراق نے منطق کا سانچہ ہمیں دے دیا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ قرآن کے دلائل و براہین بھی اس میں ڈھالیں۔

غرض کہ جس گوشے میں جاؤ گے، یہی اصل سامنے پاؤ گے۔

(۲) جب کسی کتاب کی نسبت یہ سوال پیدا ہو کہ اس کا مطلب کیا ہے؟ تو قدرتی طور پر ان لوگوں کے فہم کو ترجیح دی جائے گی، جنھوں نے خود صاحبِ کتاب سے اس کا مطلب سمجھا ہو۔ قرآن تیئیس (۲۳) برس کے اندر بتدریج نازل ہوا، اور جس قدر نازل ہوتا جاتا تھا، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سنتے تھے، [illegible] کراتے تھے اور جو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کچھ پوچھنا ہوتا تھا، خود پیغمبرِ اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) سے پُوچھ لیتے تھے - ان میں بعض افراد خصوصیت کے ساتھ فہمِ قرآن میں مُمتاز ہوئے اور خود پیغمبرِ اسلامؐ نے اس کی شہادت دی - مذہبی خوش اعتقادی کی بنا پر نہیں بلکہ قدرتی طور پر ان کے فہم کو بعد کے لوگوں کے فہم پر ترجیح ہونی چاہیے - لیکن بدقسمتی سے ایسا نہیں سمجھا گیا - بعد کے لوگوں نے اپنے اپنے عہد کے فکری موثرات کے ماتحت نئی نئی کاوشیں شروع کر دیں اور سلف کی صریح تفسیر کے خلاف ہر گوشے میں قدم اُٹھا دیے - کہا گیا "سلف ایمان میں قوی ہیں لیکن علم میں خلف کا طریقہ قوی ہے" حالانکہ خود سلف کا اپنی نسبت یہ اعلان تھا کہ

ابرھم قلوباً واعمقھم علماً

نتیجہ یہ نکلا کہ روز بروز حقیقت مستور ہوتی گئی اور اکثر گوشوں میں ایک صاف بات اُلجھتے اُلجھتے بالکل ناقابلِ حل بن گئی -

اس بات کا اندازہ کرنے کے لیے قرآن کا کوئی ایک مقام لے لو - پہلے اس کی تفسیر صحابہؓ و تابعین کی روایات میں ڈھونڈھو، پھر بعد کے مفسروں کی طرف رُخ کرو اور دونوں کا مقابلہ کرو - صاف نظر آ جائے گا کہ صحابہ و سلف کی تفسیر میں معاملہ بالکل واضح تھا - بعد کی بے محل دقیقہ سنجیوں نے اسے کچھ سے کچھ بنا دیا اور الجھاؤ پیدا ہو گئے -

(۳) نومسلم اقوام کے قصص و روایات اول دن سے پھیلنا شروع ہو گئے تھے - ان میں سے اسرائیلیات (یعنی یہودیوں کے قصص و خرافات) کو ہمیشہ محققین نے چھانٹنا چاہا لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان عناصر کے مخفی اثرات دُور دُور تک سرائیت کر چکے تھے اور وہ برابر جسمِ تفسیر میں پیوست رہے -

(۴) ایک طرف تو صحابہ و سلف کی روایات سے تغافل ہوا، دُوسری طرف روایاتِ تفسیر کے غیر محتاط صاحبوں نے الگ آفت برپا کر دی اور ہر تفسیر جس کا سرا کسی نہ کسی تابعی سے ملا دیا گیا، سلف کی تفسیر سمجھ لی گئی -

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۵ اس صورتِ حال کا سب سے زیادہ افسوس ناک نتیجہ یہ نکلا کہ قرآن کا طریقِ استدلال دور از کار دقیقہ سنجیوں میں گم ہوگیا۔ یہ ظاہر ہے کہ اس کے تمام بیانات کا محور مرکز اس کا طریقِ استدلال ہی ہے۔ اس کے ارشادات و بصائر، اس کے قصص و امثال، اس کے مواعظ و حکم، اس کے تمام مقاصد و مہمات سب اسی چیز سے کھلتے اور اُبھرتے ہیں۔ یہ ایک چیز کیا گم ہوئی، گویا اس کا سب کچھ ہی گم ہوگیا۔

ہمین ورق کہ سیہ گشتہ، مدّعا این جاست

انبیاء کرام ؑ کا طریقِ استدلال یہ نہیں ہوتا کہ منطقی طریقے پر نظری مقدمات ترتیب دیں پھر ان کی بحثوں میں مخاطب اُلجھانا شروع کر دیں۔ وہ براہِ راست تلقین و اذعان کا فطری طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ اسے ہر دماغ وجدانی طور پر پالیتا ہے۔ ہر دل قدرتی طور پر قبول کر لیتا ہے۔ لیکن ہمارے مفسروں کو فلسفہ و منطق کے انہماک نے اس قابل ہی نہ رکھا کہ کسی حقیقت کو اس کی سیدھی سادی شکل میں دیکھیں اور قبول کرلیں ..... نتیجہ یہ نکلا کہ قرآن کے دلائل و براہین کی ساری خوب رُوئی اور دل نشینی طرح طرح کی بناوٹوں میں گم ہوگئی .....

۶ یہ آفت صرف طریقِ استدلال ہی میں پیش نہیں آئی بلکہ تمام گوشوں میں پھیلی۔ منطق و فلسفہ کے مباحث نے طرح طرح کی نئی مصطلحات پیدا کر دی تھیں۔ عربی لُغت کے الفاظ ان مصطلحہ معانی میں مستعمل ہونے لگے۔ یہ ظاہر ہے کہ قرآن کا موضوع فلسفۂ یونانی نہیں ہے اور نہ نزولِ قرآن کے وقت عربی زبان ان مصطلحات سے آشنا ہوئی تھی۔ پس جہاں کہیں قرآن میں وہ الفاظ آتے ہیں۔ ان کے معانی وہ نہیں ہو سکتے جو وضعِ مصطلحات کے بعد قرار پائے۔ لیکن اب ان کے وہی مفہوم لیے جانے لگے اور اس کی بنا پر طرح طرح کی دور از کار بحثیں پیدا کر دی گئیں۔ چناں چہ خُلود، احدیت، تثلیث، تفصیل، حجت، برہان، تاویل وغیرہا نے وہ معنی پیدا کرلیے جن کا صدرِ اول میں کسی سامع قرآن کو وہم و گمان بھی نہ ہوا ہوگا۔

۷ اسی تخم کے یہ بھی برگ و بار ہیں کہ سمجھا گیا قرآن کو وقت کی تحقیقاتِ علمیہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کا ساتھ دینا چاہیے۔ چناں چہ کوشش کی گئی کہ نظامِ بطلیموسی اس پر چپکایا جائے ٹھیک اسی طرح جس طرح آج کل کے دانش فروشوں کا طریقِ تفسیر یہ ہے کہ موجودہ علم ہیئت کے مسائل قرآن پر چپکائے جائیں۔

(۸) ہر کتاب اور تعلیم کے کچھ مرکزی مقاصد ہوتے ہیں اور اس کی تمام تفصیلات انھیں کے گرد گردش کرتی ہیں۔ جب تک یہ مراکز سمجھ میں نہ آجائیں، دائرے کی کوئی بات سمجھ میں نہیں آسکتی۔ قرآن کا بھی یہی حال ہے۔ اس کے بھی چند مرکزی مقاصد و مہمات ہیں اور جب تک وہ صحیح طور پر نہ سمجھ لیے جائیں، اس کی کوئی بات صحیح طور پر سمجھی نہیں جاسکتی۔

متذکرۂ صدر اسباب میں سے جب اس کے مرکزی مقاصد کی وضاحت باقی نہ رہی تو قدرتی طور پر اس کا ہر گوشہ اس سے متاثر ہوا۔ اس کا کوئی بیان، کوئی تعلیم، کوئی استدلال، کوئی خطاب، کوئی اشارہ، کوئی اجمال ایسا نہ رہا، جو اس تاثر سے محفوظ ہو۔

(۹) قرآن کی صحتِ فہم کے لیے عربی لغت و ادب کا صحیح ذوق شرطِ اول ہے لیکن مختلف اسباب سے جن کی تشریح محتاجِ تفصیل ہے، یہ ذوق کم پڑتا گیا، یہاں تک کہ وہ وقت آگیا جب مطالب میں بے شمار الجھاؤ محض اس لیے پڑ گئے کہ عربیت کا ذوقِ سلیم باقی نہیں رہا اور جس زبان میں قرآن نازل ہوا تھا، اس کے محاورات و مدلولات سے یک قلم بُعد ہوگیا۔

(۱۰) ہر عہد کا فکری اثر تمام علوم و فنون کی طرح تفسیر میں بھی کام کرتا رہا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ تاریخ اسلام کا یہ پُرفخر واقعہ ہمیشہ یادگار رہے گا کہ علمائے حق نے وقت کے سیاسی اثرات کے سامنے کبھی ہتھیار نہیں ڈالے اور کبھی یہ بات گوارا نہیں کی کہ اسلام کے عقائد و مسائل ان سے اثرپذیر ہوں۔ لیکن وقت کی تاثیر صرف سیاست ہی کے دروازے سے نہیں آتی، اس کے نفسیاتی موثرات کے بےشمار دروازے ہیں اور جب کھل جاتے ہیں تو کسی کے بند کیے بند نہیں ہوسکتے۔ ان

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے استیلاء سے عقائد و اعمال محفوظ رکھے جا سکتے ہیں اور علمائے حق نے محفوظ رکھے لیکن دماغ محفوظ نہیں رکھے جا سکتے تھے اور محفوظ نہیں رہے .....

(۱۱) چوتھی صدی ہجری کے بعد علوم اسلامیہ کی تاریخ کا مجتہدانہ دور ختم ہوگیا اور شواذ و نوادر کے علاوہ عام شاہ راہ تقلید کی شاہ راہ ہوگئی۔ اس داءِ عضال نے جسمِ تفسیر میں بھی پوری طرح سرایت کی۔ ہر شخص جو تفسیر کے لیے قدم اٹھاتا تھا، کسی پیش رو کو اپنے سامنے رکھ لیتا تھا اور پھر آنکھیں بند کر کے اس کے پیچھے چلتا رہتا۔ اگر تیسری صدی میں کسی مفسر سے کوئی غلطی ہوگئی ہے تو ضروری ہے کہ نویں صدی کی تفسیروں تک وہ برابر نقل در نقل ہوتی چلی آئے۔ کسی نے اس کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ چند لمحوں کے لیے تقلید سے الگ ہو کر تحقیق کرے کہ معاملے کی اصلیت کیا ہے۔ رفتہ رفتہ تفسیر نویسی کی ہمتیں اس قدر پست ہوگئیں کہ کسی متداول تفسیر پر حاشیہ چڑھا دینے سے آگے نہ بڑھ سکیں .....

(۱۲) زمانے کی بدمذاقی نے بھی ہر کج اندیشی کو سہارا دیا۔ چناں چہ ہم دیکھتے ہیں کہ قرونِ اخیرہ میں درس و تداول کے لیے وہی تفسیریں مقبول ہوئیں جو قدماء کے محاسن سے یک قلم خالی تھیں۔ وقت کا یہ سوءِ انتخاب ہر علم و فن میں جاری رہا ہے .....

(۱۳) متداول تفسیریں اٹھا کر دیکھو! جس مقام کی تفسیر میں متعدد اقوال موجود ہوں گے، وہاں اکثر اسی قول کو ترجیح دیں گے جو سب سے زیادہ کمزور اور بے محل ہوگا .....

(۱۴) اشکال و موانع کا بڑا دروازہ تفسیر بالرائے سے کھل گیا۔ جس کے اندیشے سے صحابہ سلف کی روحیں لرزتی رہتی تھیں۔

تفسیر بالرائے کا مطلب سمجھنے میں لوگوں کو لغزشیں ہوئی ہیں۔ تفسیر بالرائے کی ممانعت سے مقصود یہ نہ تھا کہ قرآن کے مطالب میں عقل و بصیرت سے کام نہ لیا جائے کیوں کہ اگر یہ مطلب ہو تو پھر قرآن کا درس و مطالعہ ہی بے سود ہو جائے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حالانکہ خود قرآن کا حال یہ ہے کہ اول سے لے کر آخر تک تعقل و تفکر کی دعوت ہے ...... دراصل تفسیر بالرائے میں "رائے" لغوی معنی میں نہیں ہے بلکہ رائے مصطلحہ شارع ہے اور اس سے مقصود ایسی تفسیر ہے جو اس لیے نہ کی جائے کہ خود قرآن کیا کہتا ہے بلکہ اس لیے کی جائے کہ ہماری ٹھہرائی ہوئی رائے کیا چاہتی ہے اور کس طرح قرآن کو کھینچ تان کر اس کے مطابق کردیا جاسکتا ہے ...... ان مجمل اشارات سے اس بات کا اندازہ کرلیا جاسکتا ہے کہ راہ کی مشکلات و موانع کا کیا حال ہے اور کس طرح قدم قدم پر پردوں کو ہٹانا اور چپے چپے پر رکاوٹوں سے دو چار ہونا ہے۔ پھر رکاوٹیں کسی ایک گوشے ہی میں نہیں ہیں اور مشکلات کسی ایک دروازے ہی سے نہیں آئی ہیں، بیک وقت ہر وادی کی اور ہر گوشے میں نظر و کاوش ہونی چاہیے۔ تب کہیں جاکر حقیقت گم گشتہ کا سراغ مل سکتا ہے۔"[1]

مذکورہ بالا چودہ[14] اصول مقدمے کے ان چوبیس اصولوں میں سے ہیں جن کے بارے میں مولاناؒ کا خیال تھا کہ ان کو سمجھ لینے کے بعد فہم قرآن کی راہ صاف ہوجائے گی۔ اب سوال یہ ہے کہ مولاناؒ فہم قرآن کی راہ سے ان موانع کو دور کرنے میں کس حد تک کامیاب ہوئے؟ یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ ان مباحث کا اصل محل مقدمہ تھا اور بدقسمتی سے مقدمہ منصۂ شہود پر نہ آسکا لیکن اس بات کا اندازہ کرلینا چنداں مشکل نہیں۔ جن اسباب و موثرات اور مشکلات و موانع راہ کی طرف مذکورہ اصولوں میں مولاناؒ نے توجہ دلائی ہے، انھیں ذہن نشین رکھ کر تفسیر سورۂ فاتحہ، ترجمان القرآن کے نوٹ اور تفسیری مقالات اور متعدد لوگوں کے سوالوں کے جواب میں الہلال میں جو کچھ مولاناؒ نے فرمایا ہے اور سب سے آخر میں مقدمۂ تفسیر کے بارھویں باب کے اس حصے پر جو ترجمان القرآن، جلد اول (جدید ایڈیشن) میں شامل کیا گیا ہے، غور کیا جائے تو اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ مولاناؒ نے فہم حقیقت کی راہ سے بے شمار موانع دور کردیئے ہیں اور لوگوں پر قرآن کے فہم و بصیرت کا ایک نیا دروازہ کھول دیا ہے۔ مولانا سعید احمد اکبرآبادی کی یہ رائے اس

---

[1] ترجمان القرآن جلد اول، اشاعت اول، صفحات ۶۶ تا ۶۷

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

باب میں کنایت کرتی ہے :-

"کم از کم اردو میں یہ پہلی تفسیر ہے جس میں قرآن کو اس کی اصل اسپرٹ میں (کلامی، فقہی اور فنی مباحث سے بلند رکھ کر) سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے" ۵۱

مقدمہ تفسیر ۱۹۱۲ء تک نہ صرف مکمل ہو گیا تھا بلکہ اس کا خاصا حصہ چھپ بھی گیا تھا۔ مقدمے کے ابتدائی صفحات جو دستیاب ہو گئے ہیں انہیں سے بارھویں باب کا جو حصہ ترجمان القرآن جلد اول (مطبوعہ ساہتیہ اکیڈمی دہلی اور سندھ ساگر اکیڈمی لاہور) میں بطور فاتحۃ الکتاب شامل کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں محمد اجمل خان صاحب فرماتے ہیں :-

"آخر کار ۱۸ مارچ ۱۹۱۶ء کو گورنمنٹ بنگال نے کلکتہ سے اخراج کا حکم دیا اور مولاناؒ رانچی چلے گئے۔ اس زمانے میں مولانا نے مقدمہ چھپوایا تھا جس کے ابتدائی بتیس صفحات ہمیں کرم خوردہ حالت میں ملے ہیں" ۵۲

۱۹۳۰ء میں ڈسٹرکٹ جیل میرٹھ میں اس کے قدیم مسودات کی تہذیب و ترتیب کا پتا چلتا ہے لیکن مولاناؒ کی وفات کے بعد معلوم ہوا کہ ترجمان القرآن کی تیسری جلد تفسیر البیان اور مقدمہ تفسیر میں سے کوئی کتاب معرض تحریر میں نہیں آئی۔ اب ہمارے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ ہم یہ بات مان لیں کہ اس وقت ان میں سے چیز موجود نہیں۔ ان کے لکھے جانے اور پایۂ تکمیل کو پہنچنے کے ہمارے پاس جتنے قوی دلائل ہوں، حقیقت وہی ہے جیسا کہ مولانا غلام رسول مہر فرماتے ہیں :-

"محض دلائل کی پختگی یا قرائن کی ایک خاص صف بندی سے وہ چیزیں وجود میں نہیں لائی جا سکتیں، جو نہیں مل رہی ہیں" ۵۳

---

۵۱ تبصرہ بر ترجمان القرآن، ماہنامہ برہان دہلی بابت ماہ اگست ۱۹۶۷ء صفحہ ۱۶

۵۲ ترجمان القرآن جلد اول ناشر ساہتیہ اکیڈمی دہلی صفحہ ۵۰ - ترجمان القرآن جلد اول ناشر سندھ ساگر اکیڈمی لاہور صفحہ ۴۳

۵۳ باقیات ترجمان القرآن مرتبہ غلام رسول مہر ناشر شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور صفحہ ۱۴

© rasailojaraid.com